زبان قرآن کی شناخت

(قسط نمبر ۳)

آیۃ اللہ محمد ہادی معرفت

قول

لغت میں ''قول'' وہ بات اور گفتار ہے جو ظاھراً تلفظ ہو یعنی زبان پر جاری ہونے والے کچھ الفاظ جیسے قالَ، تکلّم، نَطَقَ۔ ''لسان العرب'' میں ہے:

القول: الکلام علیٰ الترتیب، وھو عند المحققین کلُّ لفظٍ قال بہ اللسان تاما کان او ناقصا.

قول ترتیب (تالیف) شدہ کلام ہے اور محققین کے نزدیک زبان سے جاری ہونے والا ہر وہ لفظ ہے جو چاہے مکمل (مفید) ہو یا نامکمل (غیر مفید) سیبویہ کہتا ہے:

بسا اوقات اعتقاد اور رائے کو ''قول'' کہا جاتا ہے جب کہ وہ مجازی مفہوم ہے اس لیے کہ عقائد اور رائے میں مخفی امر یا قول کی جگہ لینے والی چیز کو قول و لفظ کے ذریعے سے ہی معلوم کیا جاتا ہے، گویا وہ مخفی رائے اور عقیدہ قول کا سبب ہے اور قول اس کی دلیل چنانچہ یہی تعلق (سبب ہونا اور مدلول پر دلالت کا سبب بنتا) ہی عقیدے اور رائے پر قول کے اطلاق کا موجب بنتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ جس طرح قول کو عقیدہ سے '' کنایۃ'' اخذ کیا گیا ہے اسی طرح کلام کو بھی عقیدے کی علامت قرار دیا جاتا مگر کبھی بھی کلام کو قول کی جگہ عقیدے اور رائے کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا گیا۔ آخر کیوں؟

تو جواباً کہا جائے گا کہ ایسا اس بنا پر ہے کہ قول کلام کی نسبت عقیدے سے زیادہ نزدیک ہے اس لیے کہ اس ناقص اور غیر مستقل کلام پر بھی ''قول'' کا اطلاق ہوتا ہے جو مفید (کلام) ہونے کیلئے اپنے تکملہ کا محتاج ہوتا ہے جیسے وہ جملے ہیں جو اپنے بقیہ (جملوں) کے محتاج ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان پر قول کا اطلاق درست ہے جبکہ ان پر کلام کا اطلاق صحیح نہیں اسی طرح عقیدہ وہ ہے جو کہ اپنی افادیت ظاہر کرنے کے لیے اس عبارت اور الفاظ

کا محتاج ہوتا ہے جو اسے نمایاں کر سکیں۔

مختصر یہ کہ قول میں اظہار عقیدہ کا پہلو ہوتا ہے جو کہ عقیدے اور رائے کی جگہ بروئے کار لایا جاسکتا ہے اور محض تلفظ، نطق اور سخن کا مفہوم نہیں لیکن کلام صرف اور صرف سخن (گفتگو) ہے یہی وجہ ہے کہ ''قول'' غیر انسان کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

قالت لہ الطیر تقدم راشداً　　انّك لا ترجع الّا حامداً

ایک اور شاعر نے کہا:

قالت له العينان سمعاً و طاعة　　وحدرتا كالدر لما يثقب

ایک اور قول ہے:

إمْتلاء الحَوْض وقال قَطْنِی

مذکورہ بالا ان تمام مثالوں میں زبان حال مراد لی گئی ہے نہ کہ زبان مقال۔

راغب اصفہانی کہتا ہے:

اگرچہ ''قول'' کو کئی طرح سے بروئے کار لایا جاتا ہے تاہم ان میں سے نمایاں ترین قول وہ لفظ ہے جو حروف کا مرکب ہو اور نطق کے ذریعے انجام پائے چاہے وہ مفرد ہو یا جملے کی صورت میں ہو۔

دیگر مواقع جہاں قول کو بروئے کار لایا جاتا ہے درج ذیل ہیں:

۲۔لفظوں میں اظہار سے قبل ذہن میں متصور (قول) جیسا کہ اس آیت میں ہے:

... وَ يَقُوْلُوْنَ فِیْ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ... (سورہ مجادلہ ۸)

اور وہ اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اگر وہ واقعی رسول ہے تو پھر اللہ ہمیں سزا کیوں نہیں دیتا۔

یہاں لوگوں نے اپنے دلوں میں جو گمان رکھا اس کے تصور کو قول کا نام دیا گیا ہے۔

۳۔محض عقیدہ بھی قول کہلاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے حضرت ابو حنیفہؒ کے قول کو اپنایا یعنی ان کی رائے کو پسند کر کے ان کا ہم عقیدہ بن گیا ہے۔

۴۔مطلق دلالت کو بھی قول کہتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

امتلاء الحوض وقال قطنی۔

حوض بھرا ہے، جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ میرے لیے کافی ہے۔

۵۔کسی ایسی چیز سے لگاؤ جو راسخ عقیدے تک پہنچا دے۔جیسے یہ کہا جائے کہ فلاں شخص اس طرح کے قول کا حامل ہے یا جیسے "فلان يقول كذا" یعنی فلاں شخص یوں کہتا ہے اس لیے کہ یہ انقصاص ہی اسے اس

قول تک پہنچاتا ہے۔

۶۔ علمائے منطق کی اصطلاح بھی قول کہلاتی ہے جیسے قول جوہر، قول عرض ہے جنہیں مقولات یعنی موضوعات میں شمار کیا جاتا ہے۔

۷۔ قول الہام کے معنوں میں بھی آیا ہے جیسے اس آیت میں آیا ہے:

... قُلْنَا یٰذَاالْقَرْنَیْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا۔

(کہف:۸۶)

ہم نے کہا اے ذوالقرنین تمہیں اختیار ہے چاہے انہیں سزا دو اور چاہے ان سے حسن سلوک اختیار کرو۔

اس لیے کہ یہ گفتگو خطاب کی صورت میں نہیں بلکہ الہام اور القائے باطنی تھا۔ اسی طرح یہ آیت ہے:

ذٰلِكَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ۔ (مریم:۳۴)

یہ ہے مریم کے بیٹے عیسیٰ کا سچا قصہ، جس میں یہ لوگ خواہ مخواہ شک کرتے ہیں۔

اس آیت میں عیسیٰ (ع) کو قول حق کا نام دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور آیت میں انہیں کلمہ سے تعبیر کیا گیا:

وَ كَلِمَتُهٗۤ اَلْقٰهَاۤ اِلٰی مَرْیَمَ... ۔ (نساء:۱۷۱)

یہ اشارہ ہے اس آیت کی طرف:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۔ (آل عمران:۵۹)

قرآن میں بھی ''قول'' کی اصطلاح کو غیر انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے قطع نظر اس امر کے کہ انہیں مخاطب قرار دیا جائے یا ان سے قول کو نقل کیا جائے۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ۔ (فصلت:۱۱)

پھر اس نے آسمان کی طرف قصد کیا درآنحالیکہ وہ دھواں تھا پس اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ تم دونوں معرض وجود میں آؤ، خوشی یا کراہت سے۔ دونوں نے کہا ہم اپنی خوشی سے بات ماننے والے ہو کر آئے ہیں۔

یہاں زمین و آسمان سے کہنے اور زمین و آسمان کے کہنے سے کیا مراد ہے؟

علامہ طباطبائی قدس سرّہ نے لکھا ہے کہ یہاں وہی مقصود ہے جو سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۷ میں بیان ہوا:

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، وہ جب کسی کام کے کرنے کا طے کر لیتا ہے تو وہ صرف کُن (ہوجا) فرما دیتا ہے اور وہ (کام) ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سورہ یٰسین کی آیت ۸۲ میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔

بتحقیق اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے کہ اس کے لیے کن ہو جا فرما دیتا ہے اور وہ کام ہو جاتا ہے۔

ان دونوں آیات کریمہ میں باطنی ارادے اور خواہش کے اظہار کو بطور کنایہ قول سے تعبیر کیا گیا ہے چاہے وہ جس طرح سے بھی ہو۔ لہذا قول (کہنا) لفظ سے نہیں۔ یہاں کسی قسم کی گفتگو (طرفین میں) نہیں تھی سوائے اس کے کہ یہ گفتگو باطنی ارادہ و خواہش کے اظہار اور بیان کرنے والی ہے۔ اس لیے ہر وہ گفتگو جو ارادے اور خواہش کے اظہار کا باعث بنے اسے قول کہا جاتا ہے۔ اس کا لازمہ وہ مقصود ہوتا ہے جس سے اظہار مراد ہو۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۔ (ق: ۳۰)

اس دن جب ہم دوزخ سے کہیں گے کیا تو بھر چکی ہے اور وہ کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے؟

یہاں بھی سخن و گفتار کا کوئی وجود نہیں، بلکہ جو کہا گیا وہ زبان حال ہے دوزخ میں موجود گنجائش کے اندازہ کی طرف اشارہ ہے۔ جس قدر بھی اس میں ڈالا جائے گا اس میں اضافہ نہیں ہوگا اور یہ قول ان لوگوں کے رد میں ہے جو یہ کہتے ہیں کہ کیا جہنم میں اتنی گنجائش ہے کہ یہ سارے کفار اس میں ڈالے جا سکیں۔

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔

(ھود: ۴۴)

اور کہا گیا اے زمین اپنے پانی کو نگل جا اور اے آسمان تو تھم جا اور پانی زمین میں جذب ہو گیا اور معاملے کا فیصلہ کر دیا گیا اور کشتی کوہ جودی پر ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ ظالموں کی قوم کے لیے ہلاکت ہو۔

اس قول میں خدا کے ارادے اور خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔

اسی طرح یہ آیت ہے:

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۔ (الانبیاء: ۶۹)

یہاں بھی صرف اور صرف ارادۂ پروردگار کا اظہار ہے چنانچہ اس آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ ہم نے چاہا کہ آگ ٹھنڈی رہے اور سلامتی کا باعث رہے چنانچہ ایسا ہی ہوا یہاں لفظ ''کونی'' (ہو کر رہے) ، بروئے کار نہیں لایا گیا۔

اسی طرح:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ ھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ ۔(بقرہ: ۲۴۳)

کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلتے تھے اور وہ کئی ہزار تھے بس اللہ تعالیٰ نے ان کو فرمایا کہ مر جاؤ۔ پھر انہیں زندہ کیا گیا۔

اس آیت میں بھی قول صرف ان کی موت سے متعلق ارادۂ پروردگار سے عبارت ہے اور: فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا ان سے کہا مر جاؤ اور و احیاھم اور انہیں دوبارہ زندہ کیا، کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ یعنی پہلے انہیں موت دی پھر زندہ کیا۔ یا پھر یہ کہ "فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ۔ یعنی پہلے انہیں کہا مر جاو پھر کہا کہ زندہ ہو جاؤ۔ بلکہ ارادہ پروردگار ان کے مرنے کے بعد انہیں زندہ کرنے سے بھی متعلق تھا اور اسی کا اظہار کیا گیا ہے۔

قرآن میں حیوانات کی طرف قول کی نسبت بھی اسی بنیاد پر ہے یعنی باطنی خواہش کا اظہار چاہے وہ کسی بھی ذریعے سے ہو۔ اگرچہ کوئی ایسی دلیل موجود نہیں کہ وہ اظہار کسی لفظ یا صدا یعنی صوت سے انجام پذیر ہوا ہو۔ چیونٹی کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

... قَالَتْ نَمْلَۃٌ یٰٓاَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُہٗ وَ ھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۔ (نمل ۱۸)

ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو۔ اپنے اپنے بلوں میں گھس جاو ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں روند ڈالے اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کی گفتگو انسانوں میں ہوتی ہے حیوانات میں بنیادی طور پر ایسی گفتگو نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے پیغامات ہوا کی لہروں سے لیتے اور دیتے ہیں اور ان (حیوانات) سے الفاظ یا آواز وغیرہ ظاہر نہیں ہوتی۔

یہی صورت حال حضرت سلیمان کے لیے پیغام لانے والے ''ھد ھد'' کے بارے میں ہے چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَکَثَ غَیْرَ بَعِیْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِہٖ وَ جِئْتُکَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ ○ اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَۃً تَمْلِکُھُمْ وَ اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ وَّ لَھَا

عَرْشٌ عَظِيْمٌ ۝ وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ۔۔۔ (نمل: ۲۲ تا ۲۴)

پھر زیادہ دیر نہ ہوئی کہ وہ آ گیا پھر کہنے لگا میں نے ایسی بات معلوم کی جو تمہیں معلوم نہیں اور میں (ملک) سبا سے تمہارے پاس ایک یقینی خبر لایا ہوں میں نے ایک عورت کو پایا جو ان پر حکومت کرتی ہے اور اسے ہر چیز سے حصہ دیا گیا ہے اور اس کے لیے بڑا شاہی تخت ہے اسے اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ کی بجائے سورج کی پرستش کرتے پایا۔

کیا یہ کلام بالمشافہ، لفظی یا تکلم کے ذریعے تھا؟ ہرگز ایسا نہیں اس لیے کہ حضرت سلیمان نے خود فرمایا:

وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ يٰاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۔ (نمل: ۱۶)

اور سلیمان داؤد کا وارث ہوا اس نے کہا: اے لوگو ہمیں پرندوں کی بولی سکھلائی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا اور یقیناً یہ کھلم کھلا فضیلت ہے۔

یہ حضرت سلیمان پر اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی کہ وہ حضرت داؤد کے وارث قرار پائے اور انہیں پرندوں کی بولی سکھلائی گئی یعنی انہیں اس بات پر قدرت عنایت ہوئی کہ وہ پرندوں کے پیغامات کو جان سکیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ پرندے انسانوں کی طرح باتیں کرتے ہوں۔ لہذا وہ چیز جو کسی کا پیغام یا کسی کی خواہش دوسرے تک پہنچانے کا ذریعہ بنے اسے قول کہا جاتا ہے اور پیغام کا وصول کرنا ویسے ہی ہے جیسے کسی کی گفتگو سننا۔

ملائکہ اور شیاطین سے منسوب قول بھی اسی نوعیت کا ہے جیسے کوئی پیغام بھیجنا یا موصول کرنا ہے اور اس ضمن میں ہرگز یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ (قول) انسانوں کے قول کی مانند ہوگا اس لیے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے اور یہ امر لازمی ہے کہ مجردات کا مادیات پر قیاس نہ کیا جائے اور حیوانات کے بولنے کو انسانوں کی گفتگو جیسا نہ سمجھا جائے۔

انسان کے پاس اپنے باطنی پیغام کو بھیجنے اور وصول کرنے کے مخصوص وسائل ہیں جبکہ دیگر مخلوقات کے پاس بھی اپنے مخصوص وسائل ہیں اس لیے ضروری ہے کہ مخلوقات و موجودات کی مختلف انواع کو جو ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں یکساں خیال نہ کیا جائے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ انسان ہر چیز کا اپنی ذات پر ہی قیاس کرے اور سب کو اپنے جیسا سمجھے شاید اس طرح کی سوچ کا سرچشمہ خود پسندی اور خود خواہی ہوتی ہے اور آدمی تمام اشیاء کو پرکھنے کا معیار اپنی ذات کو قرار دینے لگتا ہے۔

مثلاً خداوند عالم نے ملائکہ سے جو گفتگو فرمائی ہے اور انہیں پیغام دیا ہے یا ملائکہ نے اللہ کے جواب میں جو کچھ کہا ہے اسے انسان کے کلام سے نہیں سمجھنا چاہیے اور یہی صورتحال ابلیس کے متعلق بھی ہے۔ آپ قرآن کریم کی سورت بقرہ کی آیات ۳۰ تا ۳۴ کا مطالعہ فرمائیے، سورۃ اعراف کی آیت ۱۱ تا ۱۸ کو دیکھئے نیز سورہ

ص آیت ۷۱ تا ۸۴ کو پڑھیے جہاں فرشتوں اور خالق کائنات کے مابین طویل مکالمہ نظر آتا ہے۔

اس طرح کی طولانی گفت وشنید کو اگر ہم زبان حال نہ کہیں تب بھی ہمیں یہی کہنا پڑے گا کہ انسانوں جیسی ''زبان مقال'' نہیں ہے اس لیے کہ یہ ایک فاقد الوجہ قیاس ہے۔(ایک ایسا قیاس جس کا کوئی سبب اور موجب ہی نہ ہو)

خاص طور پر اس جگہ جہاں شیطان نے انسانوں کو مخاطب قرار دیتے ہوئے ان سے جو باتیں کی ہیں وہ انسانی ذہن میں فتور اور وسوسے پیدا کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (حشر:۱۶)

کبھی بھی ابلیس اور انسان کی بالمشافہ بات چیت نہیں ہوئی کہ وہ اسے حکم دے کہ وہ کافر ہو جائے بلکہ یہ صرف وسوسہ اور باطنی تحریک ہے جو کہ ابلیس کے ذریعے انجام پذیر ہوتی ہے اور جو اس کی زبان حال ہے۔ پھر جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو انسانوں کا مذاق اڑاتا ہے کہ کس طرح دھوکا کھا کر انہوں نے اس کے بے وقعت وسوسوں کو قبول کر لیا اور اپنی عقل وفطرت کے پیغام توحید کو ذرّہ بھر اہمیت نہ دی۔

قرآن کریم میں قیامت کے دن کے حوالے سے ابلیس کی جو گفتگو نقل ہوئی ہے وہ بھی اسی نوعیت کی ہے۔

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ۔(ابراہیم:۲۲)

اور جب سب امور کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا پھر میں نے تم سے وعدہ خلافی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میرا کہنا مان لیا پس تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ہی ملامت کرو۔ نہ میں تمہارا فریاد رس ہوں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو۔جس کا تم نے مجھے شریک بنایا تھا میں تو اس کا پہلے ہی سے منکر تھا۔

یہ گفتگو اپنے استدلال کے ساتھ مکمل طور پر واقعات کے واضح ہونے کی حکایت کرتی ہے اس دن سب پر حقیقت واضح اور آشکار ہو جائے گی کہ انسانوں کے مقابلے میں ابلیس کی حالت اور کیفیت یہ ہو گی کہ وہ انسانوں پر حیرت کا اظہار کرے گا کہ انہوں نے اس کی بے وقعت باتوں کو کس طرح قبول کر لیا جبکہ انسان

شیطان کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہوں گے۔ درحقیقت انہیں یقین نہیں تھا مگر پھر بھی ان لوگوں نے بے حقیقت وعدوں پر اعتبار کر کے اپنے دلوں کو خوش رکھا۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ۝ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ۔

(قیامت: ۱۴۔۱۵)

بلکہ انسان اپنے نفس کا برا دیکھنے والا ہے اگرچہ وہ اپنے عذر پیش کیا کرے۔

اور اسی طرح جنگ بدر کے موقع پر مشرکین سے یہ گفتگو بھی قرآن کریم میں منقول ہے:

وَاِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ۔ (انفال: ۴۸)

اور جب شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے آراستہ کر دیا اور اس نے کہا کہ آج کے دن تمہارے آدمیوں پر کوئی بھی غالب نہیں آئے گا اور میں یقیناً تمہارا مددگار ہوں پھر جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو دیکھا یعنی ایک دوسرے سے لڑنا شروع کیا تو شیطان اپنی ایڑیوں پر پلٹ گیا اور کہنے لگا یقیناً میں تم سے بری ہوں اور بے شک میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے میں تو یقیناً اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

یہاں یہ جملہ: وَ قَالَ: لَا غَالِبَ لَكُمْ۔ درحقیقت ان (مشرکین) کے اس کردار کو سراہنا ہے کہ مشرکین اپنے دم خم اور اسلحے کی بناء پر یہ خیال کر رہے تھے کہ کوئی بھی ان کے سامنے مقاومت کرنے کی جرات نہیں کر سکتا اور ان کی طاقت کے سامنے کوئی بھی نہیں ٹھہر پائے گا۔

لہٰذا یہ گفتگو سوائے اس بے وقعت گھمنڈ کی تحریک اور القا کے کچھ بھی نہیں جس کا منبع و سرچشمہ خود ان مشرکین کا غیر دانشمندانہ کردار اور طرز عمل تھا۔

مختصر یہ کہ ان مذکورہ تمام آیات میں سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہ باطنی خواہش کے اظہار کو قول سے تعبیر کیا گیا ہے مگر اس طرح سے نہیں جیسے انسان ظاہر کرتے ہیں اور ضروری ہے کہ اس طرح کا قیاس نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ ہر موجود اپنے باطن کے اظہار کے لیے مخصوص وسائل رکھتی ہے جو کہ اس کی حیثیت اور کیفیت کے متناسب ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆